ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

پاکستان میں معاشی محرومیوں کی وجوہات: تجزیاتی مطالعہ

CAUSES OF ECONOMIC DEPRIVATION IN PAKISTAN
AN ANALYTICAL STUDY

☆محمد علی یزدانی

ایم فل اسکالر، شعبہ اسلامی فکر و تہذیب، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور

ABSTRACT

If valuable and serious measures are not taken by the government and non-government sectors to alleviate the hunger of the poor, then such distressing situations will arise which make the human heart weep eight or eight tears. They need support and comfort, they need a cool place to protect them from the heat and a warm habitat to protect them from the cold in winter, they are forced to work at home due to compulsion and poverty. Elderly people who have reached the age of sixty or seventy are seen carrying loads beyond their strength in big plazas, markets, private hospitals, bus stands and markets. She deserved the rope, she is contributing to the development of the society in a state of compulsion, but the stony eyes and bent backs make the conscience of many wealthy people tremble that when they come out of the shell of wealth and wealth, they are suffering and groaning humanity. who are the owners of millions, millions and billions, considering the world as their total, they are not making the oppressed humanity a sharer in their wealth, although the rights of both the beggars and the deprived are in their wealth. Yes, Islam has obliged them to keep a fair share of the poor and indigent people in their wealth, only if the system of Zakat is released on a just basis, many helpless faces will open with joy, Many stoned eyes will shine. Arise, let many a bowed waist be straightened, and many a widow and fatherless may dignify two days' bread.

Keywords: *Alleviate the hunger of poor, Poverty compulsion, development of society, groaning humanity.*

ذریعہ معاش کسی بھی قوم و ریاست کے لیے بنیادی حیثیت کا مسئلہ ہے، اس کے مناسب اور پائیدار حل میں اگر رکاوٹیں کھڑی ہوں تو ریاست و حکومت مضطرب و بے چین نظر آتی ہے، معاشی محرومیوں کے نتیجے میں نہ صرف حکمران پریشان ہوتے ہیں بلکہ اس کی براہِ راست عوام پر زد پڑتی ہے، جس سے کئی طرح کے مسائل، مثلاً: بھوک و فلاس، صحت کے مسائل، ناخواندگی کے مسائل حتی کہ فتنہ و فساد اور معاشرتی و سماجی افراتفری بھی معاشی محرومیوں کے نتیجے میں جنم لیتی ہے۔ ان تمام مشکل حالات کے پس منظر میں جہاں کئی سالوں کی ناگفتہ بہ صورتحال ہوتی ہے وہاں ایک بہت بڑا عنصر ریاست کے معاونین جو وزراء اور مشیران کی صورت میں براجمان ہوتے ہیں، وہ مفادات کی بھینٹ چڑھ کر ملک و قوم کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں، جس سے معاشی سدھار آتے آتے لوگوں کی آنکھیں ترس جاتی ہیں، عوام حکومت کے فیصلوں سے مایوس اور ناامید ہو جاتے ہیں۔ اسی افراط و تفریط کے عالم میں کئی لوگ ایسے نظریات پر کاربند ہو جاتے ہیں جو ملک و قوم کے لیے انتہائی خطرناک اور تشویش کا باعث بنتے ہیں، ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ اداروں اور افراد کے مناسب حل تجویز نہ کرنے سے بسا اوقات ممکنہ وسائل اور امکانات بھی زائل ہو جاتے ہیں، جس کی بنیادی وجہ عدم دلچسپی، غیر سنجیدگی اور طبقاتی کشمکش ہے۔

اقوام عالم کی طرح پاکستان بھی شدید ترین معاشی مسائل کی زد میں ہے، جس سے معاشرتی اور طبقاتی کشمکش جنم لے رہی ہے، ایک طرف دولتمند طبقہ تمام تر وسائل پر کسی نہ کسی صورت میں قابض ہے، دوسری طرف پسماندہ طبقہ دن بدن روبۂ زوال ہو رہا ہے ، اس کی بہت سی جائز اور بنیادی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں، جس پر وہ نہ صرف ظلم کی چکی میں پس رہا ہے بلکہ اپنی تمام تر محرومیوں پر اہل ارباب سے شکوہ کناں ہے۔

اسلام معاشی ترقی کی اس قدر مضبوط اور جامع انداز میں ترجمانی کرتا ہے کہ ایک دولت مند گھرانے کو اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے اسے بھوکے پڑوسی کا خیال رکھنا پڑے گا، ایک مخدوم کو خادموں کا خیال رکھنا پڑے گا، ایک حاکم کو محکوم کی داد رسی کرنی پڑی گی، اخوت و مودت کی حقیقی ترجمانی کے لیے ایک دولتمند بھائی کو دوسرے مفلوک الحال کی مدد کرنی ہو گی، حقوق و فرائض کی انجام دہی ہی وہ صورت ہے جس سے معاشرتی ربط، اور قوم کو منظم کیاجاسکتا ہے۔

دنیا کے تمام نظام چاہے ان کا تعلق سماجیات سے ہو، معاشرت سے ہو، نظام تعلیم سے ہو، براہِ راست معاشیات سے جڑے ہوئے ہیں، انسان اس معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنے کا تصور نہیں کرسکتا، اسے بہرحال انہی معاشرتی اقدار اور اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو مکمل کرنا ہوتا ہے، زندگی کی یہ ترتیب بسا اوقات غیر مرتب کیفیت سے بھی دوچار ہوتی ہے مگر پھر بھی ترتیب میں آنا اور خود کو سنبھالنا عقل و خرد رکھنے والے شخص کے لیے بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد اسلام کا معاشی نظام جو محرومیوں کے تدارک کا بڑا سبب ہے، اس سے متعلق لکھتے ہیں:

”معاشی نظام کے چار اصول :

۱۔ انسانی ملکیت کی کلی نفی

۲۔ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ کا فضل ہے، گو دکان پر وہ بیٹھا ہے، کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے، محنت اس نے کی ہے، لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھے، اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حقِ ملکیت جتاؤ گے لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں سے اپنا حق اسی قدر سمجھو گے جس قدر اللہ نے معین کیا ہے۔ انسان کا جائز حق کیا ہے؟ صرف اس کی ضروریات کے بقدر، ان کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے۔

الف: اگر دو وقت کھانے کے لیے مل گیا ہے۔

ب: سر چھپانے کے لیے اگر کوئی چھت موجود ہے۔

ج: پہننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔

د: اور اپنے کردار، اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر ایک بیوی مل گئی ہے۔

تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا اور اس سے زائد جو کچھ ہے وہ تمہارا نہیں دوسروں کا حق ہے، اس کو پہنچا دو ان تک کہ جن کے پاس نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے کہ جو امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کر دی گئی تھی اور یہی ہے درحقیقت وہ مقام جہاں تک ”قل العفو“ کا سارا فلسفہ پنچانا چہات اہے کہ تمہارے پاس جو بھی قدر زائد ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ، ضرورت پوری ہو گئی تمہارا حق مکمل ہو گیا، اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہے مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔ گویا یہ ایک مکمل نظام ہے، اس میں ملکیت اور قدر زائد اور یہاں تک کہ اس قدر زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ملازم ہے اس کو تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے، اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں، ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) یہ بھی درحقیقت اس روحانی سطح پر ربو ہی قرار پائے گا کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمایے کا مصرف صرف ایک ہے کہ اس کا مالک محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے، یہ ان کو دے دیا جائے کہ جو محروم ہیں، یا جن کے پاس کاروبار کے لیے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے، گویا فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر جائز ہے مگر روحانی اور اخلاقی تعلیم میں یہ چیز ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے“۔[1]

عوام کو معاشی آسودگی فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، ایک آزاد، خود مختار، اسلامی و فلاحی ریاست اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک قرآنی تعلیمات پر مبنی عہد نبوی کے ان فرامین پر عمل نہ کیا جائے جن سے عوام و حکمران دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں سے خوب واقف تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”اے ابن خطاب! اپنے بعد تمہیں خلیفہ بنانے میں میرے پیش نظر وہ امور و مسائل ہیں جن کو میں چھوڑے جا رہا ہوں، میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ آپ ﷺ کس طرح ہم کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، اور ہمارے بال بچوں کا اپنے بال بچوں سے زیادہ خیال رکھتے تھے، یہاں تک کہ ہمارا یہ دستور ہو گیا تھا کہ ہم آپ ﷺ کے گھر والوں کو جو تحائف بھیجتے تھے وہ آپ ہی کے بچے ہوئے تحائف ہوتے تھے جو ہمارے پاس خود آپ کے یہاں سے آتے تھے، تم میرے ساتھ رہے ہو اور تم نے دیکھا ہے کہ میں اپنے پیش رو کے نقش قدم پر چلتا رہا ہوں، اللہ کی قسم میں نے خواب و خیال میں بھی کبھی راہ راست سے قدم نہیں ہٹائے ہیں“۔[2]

---

[1] اسرار احمد، ڈاکٹر، ”اسلام کا معاشی نظام“، مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور، ص:۱۷‘۱۸

[2] ابو یوسف، قاضی امام، کتاب الخراج، مترجم: مولانا نیاز احمد، مکتبہ رحمانیہ۔ لاہور، ص:۴۵

معاشی محرومیوں کے اسباب اور ان دو طرفہ پہلوئوں کا جائزہ لینا بے حد ضروری ہے، جن میں سے ایک پہلو عوامی اور سماجی رویے ہیں، جبکہ دوسری طرف اہل ارباب و اقتدار اپنے فیصلے عوام پر صادر کرتے ہیں، دونوں ہی جہاں سماج کے ربط اور خوشحالی کا باعث بنتے ہیں، وہیں غلط فیصلوں سے عوام پر بوجھ اور معاشی صورتحال کو دگرگوں کرنے کا بھی باعث بنتے ہیں۔ چنانچہ عوام اور حکمران دونوں کا رویہ جانچنے کی ضرورت ہے، تاکہ صحیح مسائل کا تدارک کیاجاسکے۔

کچھ ملکی وسائل جو محض عطیہ خداوندی ہیں، اس کے سماجی اور عوامی سطح پر بے جا استعمال اور بسا اوقات اسراف بھی عوام کی معاشی محرومیوں کا باعث بن رہا ہے، اس ضمن میں معاشرے کے تین معروف معیارات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

”عموماً معاشرے میں تین قسم کے معیارِ زندگی پائے جاتے ہیں:

الف۔ رفاہیتِ بالغہ یعنی عیاشانہ معیار زندگی جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز پسند کی جاتی ہے، اس طرح حد سے زیادہ بلکہ بے جا خرچ کیاجاتا ہے اور دولت کو ضائع کیاجاتا ہے۔

ب۔ رفاہیتِ ناقصہ یعنی پست معیارِ زندگی جس میں زندگی کی ضروریات بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتیں اور جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔

ج۔ رفاہیتِ متوسطہ یعنی درمیانہ معیار زندگی جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے بھی کوئی کام کر سکے اور خدا کو بھی یاد کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے رفاہیت بالغہ یعنی عیاشی کو ناپسند فرمایا ہے اور ایسی معاشرت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان دنیا کی طلب کے اندر ہی الجھ کر رہ جائے اور معیشت کی باریکیوں میں اُتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعمق اور غلو کرنے لگے، چنانچہ ریشم، سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن ، گلوبند، ہار، طوق، پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی باریکیوں میں الجھا دیتی ہیں، رفاہیت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنیٰ سے اعراض کیا جائے، لیکن رفاہیتِ بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز میں سے سب سے اعلیٰ کا انتخاب کیاجائے۔

رفاہیت ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیار زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دور پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے ، جن کی اکثریت صرف دال روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو، معاملہ جب یہ ہو جائے کہ انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی اس کی ضروریات پوری نہ ہوں تو انسان کا حیوانی سطح پر آجانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں، اس لیے اسلام نظام عدل و قسط قائم کرنا چاہتا ہے، نہ صرف قانونی نظام بلکہ سماجی عدل بھی“۔[1]

روزنامہ ”نوائے وقت“ میں ناصر علی نے ”ہم اور ہمارے معاشی مسائل“ کے عنوان سے کالم لکھا، جس میں پاکستان کے معاشی مسائل کی عکاسی کی گئی، وہ لکھتے ہیں:

”اس میں تو کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ سرمایہ کسی بھی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے اسی لیے تو دانشوروں نے کہا ہے کہ سمجھ دار لوگ برے دنوں کے لئے کچھ بچا کر رکھتے ہیں لیکن ہمارے ملک کے موجودہ معاشی حالات اس بات کی غمازی کرتے نظر آ رہے ہیں کہ آزادی کے بعد ماسوائے ابتدائی پندرہ سالوں کے جتنے حکمران بھی آئے انہوں نے معیشت کو دانشمندی سے چلانے کی بجائے اپنی ذات یا اپنی سیاسی پارٹی کے مفاد کیلیے معاشی پالیسیاں بنائیں اور اس سلسلہ میں صنعتی ترقی اور زراعت کی ترقی کیلئے جو بنیادی ڈھانچہ درکار ہوتا ہے بجلی ، گیس، پانی، ماحول، معاشی پالیسی، بینکنگ کا نظام کو یکسر نظر انداز کر دیا جو ہمیشہ ملکی قومی اور بین الاقوامی ضروریات کو مدنظر رکھ کر بنائی جاتی ہیں، ایک وقت تھا جب پاکستان کا شمار روئی، چاول، اور چائے برآمد کرنے والے سرکردہ ممالک میں ہوتا تھا جراحی کے آلات اور کھیلوں کے سامان کی صنعت تو اب بھی کوئی ثانی نہیں رکھتی چمڑا اور اس کی مصنوعات دستی قالینوں کی برآمد بھی ہماری معیشت کیلئے بہت بڑا ذریعہ تھی۔ جو آج ہماری حکومت کے ناعاقبت اندیش فیصلوں کی وجہ سے قریب المرگ ہیں۔ وہ قومیں جنکے دل میں اپنے پائوں پر کھڑا ہونے کی خواہش ہوتی ہے وہ ہمیشہ اپنی ضرورتوں کی قربانی دے کر کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہمیشہ اس کا اُلٹ ہوا ہے ہم قرضے کی منظوری پر حکومتی سطح پر خوشی منا کر عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اب تو حالت یہ ہے کہ قرضہ دینے والے ادارے اپنی شرائط پر کہ بجلی ، گیس کے نرخ بڑھائو اور سرکاری اداروں کو فروخت کرو تو قرضہ ملے گا ورنہ نہیں ، گھر کے برتن تو وہی بیچتا ہے جو اپنے گھر کا نظام نہیں چلا سکتا موجودہ حالات میں بندہ ناچیز چند تجاویز پیش کرنا چاہے گا جو ارباب بست و کشاد کی توجہ چاہے گی:

---

[1] اسرار احمد، ڈاکٹر، ”اسلام کا معاشی نظام“، ص: ۴۵، ۴۶

۱۔ فوری طور پر ملک میں سول ڈویژن کی سطح پر متبادل دنوں میں پٹرول کی ہفتہ وار تعطیل کا اعلان کیا جائے مثلا سوموار کو لاہور ، منگل کو گجرانوالہ، بدھ راولپنڈی ، وغیرہ وغیرہ یہ پروگرام حکومت لوگوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دے جس سے ہمارے درآمدی بل پر اچھا اثر پڑے گا۔

۲۔ ادارہ جاتی ڈیفالٹ پر جنگی بنیادوں پر سختی سے ادائیگی کو یقینی بنایا جائے مثلا بجلی کے نادہندگان اداروں سے ریکوری ، ریلوے کی گاڑیوں کے ٹھیکیداروں سے ریکوری۔

۳۔ بیرون ملک سفارتکاروں کی کارکردگی پہلے چھ ماہ کے ٹارگٹ برائے ملکی برآمدات بڑھانے اور افرادی قوت کی برآمد، جو سفارتکاران ٹارگٹ کو پورا نہ کر سکے اسے اگلے چھ ماہ کی ایک کا اور موقعہ دیکر وطن واپس بلالیا جائے۔

۴۔ ایسے ممالک جنہیں پہلے پاکستانی مصنوعات وسیع پیمانے پر برآمد کی جاتی تھیں لیکن سابقہ حکومتوں کی نااہلی کی وجہ سے ہندوستان اور دوسرے ممالک نے ان مارکیٹ پر قبضہ جما لیا وہاں ہر طرح کے تعلقات بروئے کار لا کر برآمد کنندگان کو خصوصی سہولیات دیکر برآمدات بڑھائی جائیں۔

۵۔ ہنگامی بنیادوں پر تمام شہروں میں ہر سطح پر دکانداروں کی ایک مخصوص اور معقول فیس کے ساتھ رجسٹریشن کی جائے جو معقول رقم کے حساب سے سالانہ تجدید کی جائے لیکن یہ تمام IT کی بنیاد پر ہو جس میں تمام بنیادی اطلاعات موجود ہوں تاکہ سرکاری اہلکار کسی قسم کی کوئی بدنیتی نہ کر سکیں۔

۶۔ سامان تعیش خصوصا موبائل ٹیلیفون لگژری گاڑیوں کی درآمد پر ایک مخصوص مدت کیلئے پابندی عائد کی جائے تاکہ ملک کی سطح پر IT اور دوسری صنعت کو فروغ مل سکے"۔[1]

اسلامی معیشت ایک متوازن طرزِ حیات ہے، اس میں حقوق و فرائض کا جامع نظام موجود ہے، لیکن اس نظام کو متوازن رکھنے کے لیے جن امور کو متعارف کرایا ہے ، کیا اسلامی حکومت ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے تگ و دو کرتی ہے،ماسوائے چند اسلامی حکومتوں کے اس کا جواب نفی میں ہے، وہ نظام جسے اسلام نے ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر اور منصفانہ کہا اور اس نظام کو زکوۃ، عشر، مضاربت اور خراج وغیرہ سے تعبیر کیا، اس کے عملی نظارے خال خال ملتے ہیں، جبکہ ٹیکس اور اس سے متعلقہ امور کا نظام دن بدن ترقی پارہا ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ معقول اور منصفانہ ٹیکسوں کا نظام بھی اسلامی معیشت کا ایک تعمیری پہلو ہے ، توکیا اس نظام کو سادہ، معقول اور منصفانہ رہنے دیا گیا ہے، آج حکمرانوں اور وزراء کی شہ خرچیاں ملک کو دیوالیہ کے قریب لے جاتی ہیں، پھر گرتے ہوئے نظام کو سہارا دینے کے لیے بیرونی قرضوں کا سہارا لینا پڑتا ہے، پھر قرضوں کی ادائیگی اور اقساط کی ادائیگی کے لیے عوام پر ٹیکس کا بوجھ ڈالا جاتا ہے، اس طرح یہ کہاجاسکتا ہے کہ پہلے اسلامی نظام کو صحیح معنوں میں رائج کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد حکومتی امور کو چلانے کے لیے عوام پر منصفانہ ٹیکس کا جواز اور عملداری ممکن ہوسکتی ہے۔ پھر اس ٹیکس کی عملداری میں امیر و غریب، حاکم اور محکوم برابر ہوں، ایسا نہ ہوکہ غریب اور متوسط طبقہ تو ٹیکسز کی زد میں آجائے لیکن اشرافیہ اور بااثر طبقہ اپنے آپ کو ٹیکس سے بری الذمہ سمجھے، جس کی عملی شکلیں آج دیکھی جاسکتی ہیں،ٹیکس معقول، منصفانہ، ضرورت کے تحت اور مساویانہ تقسیم کے تحت ہو تو اس کو جواز کی حد تک تسلیم کیاجاسکتا ہے،عادلانہ ہو نہ کہ ظالمانہ، بلاواسطہ ٹیکس لگایا جائے ، آمدنی پر ٹیکس نہ ہو بلکہ بچت پر ہو، غیر تجارتی مکانات پر ٹیکس نہ لگایا جائے، مختلف پیشوں پر ٹیکس عائد کرنا بھی درست نہیں، اسی طرح ملک میں جاری ایسی کھیلیں جو سراسر جوا اور فتنہ و فساد پر مبنی ہیں، ایسی کھیلوں یا تفریحات پر تفریحی ٹیکس لگا کر انہیں قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے، یہ تمام شکلیں اسلام کے احکامات سے متصادم ہیں جنہیں لاگو کرنے سے عوام غیر عادلانہ ٹیکس کا بوجھ برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، لہٰذا زکوۃ اور اس سے متعلقہ امور ہی معتبراور معقول نظامِ ریاست کو چلانے کے لیے کافی ہیں، اگر صحیح معنوں میں اسے عوام الناس کے سامنے اجاگر کر دیا جائے۔

معاشی نظام اس وقت عوام و خواص کو محرومیوں سے دوچار کرتا ہے، جب غیر عادلانہ رویے اور نظام اسے بری طرح جکڑ دیں، جس میں سرفہرست سودی نظام ہے، جس سے کئی طبقے بری طرح زد میں آتے ہیں، سودی نظام کی قباحتیں، اس کے مفاسد اور تباہ کاریاں کس قدر معاشروں کو اپنے اثراتِ بد سے متاثر کرتے ہیں، قرآن مجید میں سود کی لعنت، قباحت اور حرمت کا بتفصیل ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا} [2]

"اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے"

{اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ} [1]

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت"، ۱۲/نومبر،۲۰۲۱ء

[2] البقرہ،۲: ۲۷۵

”جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ تو اُس شخص کی طرح ہی اُٹھیں گے جسے شیطان نے چمٹ کر اُس کے ہوش و حواس اڑا دیئے ہوں“۔

{يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ}[2]

”اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرو اور سود کے باقی معاملات چھوڑ دو اگر تم مؤمن ہو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کرنے کیلئے تیار ہو جائو“۔

متعدد احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے سود کو حرام قرار دیا اور اس کی مذمت کرتے ہوئے اس سے بچنے کی تلقین کی:

ا۔ ’’عَنْ جَابِرٍh، قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ آكِلَ الرِّبَا، وَمُؤْكِلَهُ، وَكَاتِبَهُ، وَشَاهِدَيْهِ، وَقَالَ:هُمْ سَوَاءٌ ‘‘۔[3]

”حضرت جابرhفرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، دینے والے، اس کو لکھنے والے اور اس کی گواہی دینے والے پر لعنت فرمائی ہے نیز فرمایا (گناہ میں) یہ سب کے سب برابر ہیں“۔

٢۔ ’’عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَh، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: الرِّبَا سَبْعُونَ حُوبًا، أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ‘‘۔[4]

٣۔ نبی کریم ﷺ نے سات ہلاک کردینے والی چیزوں سے متعلق ارشاد فرمایا، جن میں سے ایک سود کا کھانا بھی ہے۔[5]

٤۔ حضرت ابن مسعودhبیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

’’ ما ظهر فی قوم الزنا والربا إلا أحلوا بأنفسهم عذاب الله‘‘۔[6]

”جس قوم میں زنا اور سود کی وبا پھیل جائے پھر وہ اپنی جانوں پر اللہ کا عذاب حلال قرار دے دیتے ہیں“۔

پاکستان کے آئینی ادارے ”اسلامی نظریاتی کونسل“ نے ملک سے سود کے خاتمے کے لیے ارباب اقتدار کو جابجا سفارشات مرتب کرکے پہنچائیں، جس کا مقصد عوام کو معاشی بحران سے نکالنا اور ظلم کا انسداد ہے، سود سے متعلق توجہ مبذول کراتے ہوئے کونسل نے کہا:

اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کرائی جاتی ہے کہ ربا یا سود کا مسئلہ معیشت کمیٹی کے ایجنڈا پر نہیں تھا، کتاب و سنت کے صریح احکام کے پیش نظر تمام امت مسلمہ کا اس کی حرمت پر اجماع ہے، نیز سپریم کورٹ آف پاکستان ربا کے موضوع پر اپنے حالیہ تاریخ ساز فیصلے میں پاکستانی معیشت سے سود کے خاتمہ کا حکم جاری کر چکی ہے، لہٰذا اس مسئلہ پر نہ تو دو آراء ہو سکتی ہیں اور نہ اس مسئلہ پر مزید بحث کا سوال پیدا ہوتا ہے...

سپریم کورٹ شریعہ اپیلیٹ بینچ کے حالیہ فیصلے میں حکومت کو ملک سے ربا کے مکمل خاتمہ کے لیے ایک سال کی جو مہلت دی گئی ہے، یہ مسئلہ بھی کمیٹی کے پہلے سے طے شدہ ایجنڈے پر موجود نہیں تھا، البتہ ملک کے اقتصادی نظام میں اسلامی اصول و احکام کے مطابق ہمہ گیر اقتصادی اصلاحات کے ضمن میں اس موضوع پر بھی مختصر گفتگو ہوئی جس میں اتفاق رائے اس بات پر تھا کہ حکومت کو سپریم کورٹ کی طرف سے دی گئی اس مہلت سے خلوصِ نیت کے ساتھ پورا پورا فائدہ اٹھایا چاہیے اور تمام شعبوں میں ربا کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے منظم تیاریاں کرنی چاہئیں، بنکاری، سرمایہ کاری، تجارتی کاروبار، سرکاری لین دین، صنعتی کاروبار، درآمد برآمد، مزدور اور سرمایہ کار کے روابط اور حقوق و فرائض، شعبہ تعلیم میں لاربائی نظام چلانے کے لیے کارکنوں کی تیاری اور اسلامی بنیادوں پر تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے اس ایک سال میں مفصل لائحہ عمل (Road map) حکومت کو دینا چاہیے۔[7]

---

[1] البقرہ، ٢: ٢٧٥

[2] البقرہ، ٢: ٢٧٨۔٢٧٩

[3] مسلم، ’’الجامع الصحیح‘‘، کتاب المساقاة، باب لعن أكل الربا ومؤكله

[4] ابن ماجہ، ’’السنن‘‘، کتاب التجارات، باب التغليظ فی الربا

[5] بخاری، ’’الجامع الصحیح‘‘، کتاب الحدود، باب رمی المحصنات

[6] البانی، ناصر الدین، محمد، ”صحیح الترغیب والترھیب“، کتاب البیوع وغیرھا، باب الترغیب فی الاکتساب بالبیع وغیرہ، مکتبۃ المعارف۔ الریاض، الرقم: ١٨٦٠

[7] سالانہ رپورٹ ٢٠٠١۔٢٠٠٠ء، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد۔ پاکستان، ص: ١٩٩

” اسلامی نظریاتی کونسل نے جو یادداشت بسلسلہ اقدامات برائے خاتمہ سود بصورت قرار داد مؤرخہ ۲۷ جون ۱۹۸۱ء کے اجلاس میں منظور کی ہے، اسے عملی جامہ پہنایا جائے“۔[1]

اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے اجلاس میں خاتمہ سود سے متعلق درج ذیل تجاویز منظور کیں:

۱۔ ملک میں عوام و خواص سب کے لیے یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ مرکزی حکومت نے پہلی بار سنجیدگی سے خاتمۂ سود کی پالیسی کا اعلان کیا، اس کام کے لیے تین سال کی مناسب مدت کا ہدف مقرر کیا اور ایک حقیقت پسندانہ مرحلہ وار پروگرام اختیار کیا گیا، اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان کے لیے یہ امر بھی باعثِ اطمینان ہے کہ کونسل کی سفارش کے مطابق خاتمہ سود کے پہلے مرحلے میں ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ اور انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان سے سود لین دین یکسر ختم کر دیا گیا ہے، ہمیں قوی امید تھی کہ اس کے بعد تجارتی بنکوں سے سود ختم کرنے کے سلسلے میں بھی کونسل کی سفارشات کو عملی شکل دی جائے گی، کیونکہ خاتمہ سود کی اصل مہم یہیں سے شروع ہوتی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ان سے ملک بھر میں بالعموم اور اراکینِ کونسل میں بالخصوص مایوسی کا احساس پیدا ہوا ہے۔

۲۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے خاتمہ سود سے متعلق ایک جامع رپورٹ ملک کے ممتاز ماہرینِ معاشیات و بنکاری کے تعاون سے تیار کی اور حکومت کو پیش کر دی، اس رپورٹ میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسلامی نظامِ معیشت میں سود کا حقیقی متبادل نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری ہے اور اسی بنیاد پر تجارتی بنکوں کی تنظیم نو ہونی چاہیے، لیکن اس کے برعکس بنکوں نے جو پی ایل ایس اکاؤنٹ قائم کیے ہیں او ران کے تحت لوگوں نے جو رقوم جمع کرائی ہیں اس کا غالب حصہ سودی کاروبار میں استعمال ہو رہا ہے، ’مارک اپ‘ اور ’مارک ڈاؤن‘ کا جو طریقہ رائج کیا گیا ہے وہ خالصتاً سودی کاروبار ہے، اس باب میں عوام و خواص کسی کو کوئی شبہ نہیں کہ ’مارک اپ‘ سود ہی کا بدلا ہوا نام ہے ، اس طریقہ کے رائج کرنے سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک حکومت کی بڑی رسوائی ہوئی ہے اور اغیار کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا موقع ملا ہے۔[2]

۱۔ حکومت بنکوں سے جو قرض لیتی ہے اس پر سود یکسر ختم کر دیاجائے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ اب تمام ملکی بنک حکومت کی ملکیت ہیں۔

۲۔ مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کو جو قرض دے وہ سود سے پاک ہونا چاہیے، اس میں بھی کوئی انتظامی دشواری نہیں ہے۔

۳۔ بچت کی قومی اسکیموں سے سود ختم کیا جائے اور جب تک حکومت کو قرضِ حسنہ دینے کا رواج عام نہ ہو جائے اس وقت تک کے لیے سود کا ایسا بدل تلاش کیا جائے جو شریعت کے مطابق جائز ہو، وزارتِ مالیات کے ماہرین اور کونسل کے اراکین مل کر یہ کام کر سکتے ہیں۔[3]

ظلم سے پاک تجارت کے خواص:

سود کے بغیر جس بھی معاشرے نے اپنی معیشت چلانے کی کوشش کی، رب تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں اور برکتیں اس پر نچھاور ہونا شروع ہو گئیں، اسی طرح کے معاشی تصورات نبی کریم ﷺ نے عرب معاشرے میں پیدا کیے، جو محرومیوں کے تدارک کے لیے اکسیر ثابت ہوئے، محمد علی الصلابی لکھتے ہیں:

”حضور ﷺ ۲۰سال کے تھے جب قریش کے چند قبائل نے ایک معاہدہ کیا جس کو حلف الفضول سے تعبیر کرنے کی وجہ ابن اثیر نے نہایہ میں بیان کی ہے کہ جُرہُم کے زمانے میں بھی ایسا ہی ایک حلف (معاہدہ)ہوا تھا جس کے طے کرنے والے سب آدمیوں کے نام میں فضل آتا تھا اس لیے اسے حلف الفضول کہاگیا ہے۔ لیکن صحیح وجہ وہ ہے جو حافظ ابن کثیر نے حمیدی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عبداللہ بن حُدِعان کے گھر میں ایک ایسے (معاہدہ)میں شریک ہوا جس میں شرکت کی اگر مجھے اسلام کے زمانے میں بھی دعوت دی جائے تو میں اسے پسند کروں گا“۔[4]

پھر اس معاہدے کی تشریح آپ ﷺ نے یہ فرمائی:

’’ تَحَالَفُوا اَنْ یَرُدُّوا الْفُضُولَ علی اہلہا و الا یعد ظَالِمٌ مَظْلُومًا‘‘۔[5]

---

[1] سالانہ رپورٹ ۱۹۸۳۔ ۱۹۸۲ء، ”مجموعی سفارشات اسلامی نظامِ معیشت“، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد۔ پاکستان، ص:۵۹

[2] سالانہ رپورٹ ۱۹۸۳۔ ۱۹۸۲ء، ”مجموعی سفارشات اسلامی نظامِ معیشت“، ص:۶۰

[3] سالانہ رپورٹ ۱۹۸۳۔ ۱۹۸۲ء، ”مجموعی سفارشات اسلامی نظامِ معیشت“، ص:۶۴

[4] صلابی، محمد علی، ”سیرت النبی ﷺ“، مکتبہ دارالسلام۔ لاہور، ج:۱، ص:۸۹

[5] ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، ابوالفدا، البدایہ والنھایہ، داراحیاالتراث العربی، ج:۲، ص:۳۵۵

”انہوں نے اس بات پر باہم معاہدہ کیا کہ فضول کو اس کے حقداروں کے پاس لوٹائیں گے اور ظالم مظلوم پر زیادتی نہ کرنے پائے گا“۔

صاحب حق کو اس کا حق دلوانا، اور ظلم سے بچانا کامیاب ریاست اور فلاحی معاشرے کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، اگر لوگوں کو ظلم و جبر کے سامنے چھوڑ دیا جائے تو معاشرہ امن نہیں بلکہ معاشی بدحالی کی تصویر پیش کرنے لگے، اس ضمن میں امام رضا خان بریلوی لکھتے ہیں:

”فضول کو اس کے حقداروں کی طرف پلٹانے کا مطلب یہ ہے کہ جو فضل کسی ظالم نے زبردستی صاحب حق سے چھینا ہو اسے واپس دلوایا جائے اور ظالم کو اس کے ظلم پر قائم نہ رہنے دیا جائے۔ ابن سعد نے معاہدے کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے باہم طے کیا کہ ہم مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اسے اس کا حق دلوا کر رہیں گے۔ ابن ہشام نے اس معاہدے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ مکہ میں شہر کے کسی باشندے یا باہر سے آنے والے پر کوئی ظلم نہ ہونے دیں گے اور ظالم کے مقابلے کی تاریخ ذی القعدہ ۰ء عام الفیل لکھی ہے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ زبیر (یمن کے قبیلے) کا شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ آیا اور اس سے ایک مکہ کے سردار عاص بن وائل نے مال خرید لیا مگر قیمت نہ دی۔ اس نے بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی سہم، بنی عدی میں سے ایک ایک کے پاس جا کر فریاد کی مگر سب نے اسے جھڑک دیا اور عاص بن وائل سہمی کے مقابلے میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سب طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد وہ صبح کے وقت کوہ ابو قیس پر چڑھ گیا اور بلند آواز سے آلِ فہر کو پکار کر اپنی مظلومیت سے آگاہ کیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ چچا زبیر بن عبدالمطلب اُٹھے اور کہا کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں چھوڑا جا سکتا۔ پھر انہوں نے بنی ہاشم، بنی المطلب، بنی اس بن العزی، بنی زہرہ اور بنی تیم کو عبداللہ بن جرغان (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا چچا زاد بھائی) کے گھر جمع کیا اور وہاں سب نے عہد کیا کہ مکہ میں شہر یا باہر کا جو شخص بھی مظلوم ہو گا اس کی مدد کریں گے اور ظلم سے اس کا حق دلوا کر چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد سب مل کر عاص کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا سامان واپس لے کر دیا۔ محمد بن اسحاق نے امام زبیری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں عبداللہ بن جِدغان کے ہاں ایک ایسے معاہدے میں شریک ہوا کہ اگر مجھے سرخ اونٹ بھی اس کے بدلے ملتے تو میں اسے چھوڑ کر انہیں قبول نہ کرتا اور اگر آج دورِ اسلام میں بھی ایسے کسی معاہدے کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے ضرور قبول کروں گا“۔[1]

معاشی حالات کے سدھار کے لیے نبی کریم ﷺ کی تجارت کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی محمد سلیمان منصوری پوری لکھتے ہیں:

”آپ ﷺ پہلی مرتبہ ابو طالب کے ساتھ ۱۲ سال کی عمر مبارک میں شام کے تجارتی سفر ہو گئے۔ راستے میں آپ جو کچھ دیکھتے اس پر غور کرتے، جو سنتے اس پر سوچ بچار کرتے اور سب کچھ ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ تجارتی قافلہ کئی راستوں سے گزرتا ہوا شام کی سر زمین میں پہنچا اور بصریٰ میں پڑاو ڈالا۔ بحیریٰ راہب (عیسائی پادری) کے پاس آپ کا قیام ہوا۔ اس نے تورات و انجیل میں بیان کی ہوئی نبی آخر الزماں کی نشانیوں کو دیکھتے ہی آپ ﷺ کو پہچان لیا اور بہت ہی عقیدت و احترام کے ساتھ اس نے آپ کے قافلوں والوں کو دعوت دی اور ابو طالب کو کہا یہ سارے جہان کے سردار اور رب العالمین کے رسول ہیں۔ جن کو خدا نے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ شجر و حجر ان کو سجدہ کرتے ہیں اور ابران پر سایہ کرتا اور ان کے دونوں شانوں کے درمیان فہر نبوتہے۔ اس لیے تمہارے حق میں یہی بہتر ہو گا کہ اب تم ان کو لے کر آگے نہ جاو کیونکہ ملک شام میں یہودی لوگ ان کے بہت بڑے دشمن ہیں وہاں پہنچتے ہی وہ لوگ ان کو شہید کر ڈالیں گے۔ بحیریٰ راہب کے کہنے پر ابو طالب کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سارا مال فروخت کر دیا اور حضور ﷺ کو اپنے سات لے کر مکہ مکرمہ واپس آ گئے۔ بحیرہ راہب نے چلتے وقت انتہائی عقیدت کے ساتھ آپ ﷺ کو سفر کا کچھ توشہ بھی دیا“۔[2]

آپ ﷺ اپنا کام دیانت و راست بازی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ تاجر کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال، ایفائے عہد اور تمام وعدہ کی ہو سکتی ہے لیکن منصبنبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امین اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن ابی الحمساء ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سےپہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا کچھ معاملہ ہو چکا تھا کچھ باقی تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ پھر آوں گا۔ اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ آیا۔ تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ منتظر پایا لیکن خلاف وعدہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانیپر بل تک نہ آیا۔ صرف اس قدر فرمایا۔ تم نے مجھے زحمت دی میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں۔ ساہب نامی صحابی جب مسلمان ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ سائب نے کہا: آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان! آپ ﷺ میرے شریک تجارت تھے۔ لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔ قیس بن سائب مخزومی ایک اور صحابی بھی آپ ﷺ کے شریکِ تجارت تھے۔ وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپ ﷺ کے حسن معاملہ کی شہادت دیتے ہیں۔ جب نبی

---

[1] بریلوی، امام رضا خان، ”سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت“، شبیر برادرز۔ لاہور، ج:۱، ص:۳۴

[2] منصور پوری، سلمان، سلیمان، قاضی محمد، ”رحمۃ للعالمین“، ادارہ معارف اسلامی۔ لاہور، ص:۳۷

ﷺ جوان ہوئے تو کسب معاش کی فکر ہوئی۔ آپ ﷺ کا خیال تجارت کی طرف ہوا جو آپ کا خاندانی شغل تھا۔ اور آپ ﷺ کو اس کا خاصہ تجربہ بھی تھا۔ لیکن سرمایہ قلت کی وجہ سے مستقل کاروبار نہیں کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ کی دیانت، تجرے اور حسن معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اس لیے مالدار لوگ منافع کی شرکت پر آپ ﷺ کو سرمایہ دیتے تھے۔ آپ ﷺ نہایت محنت اور دیانت کے ساتھ ان کا کام کرتے۔ تجارت کی غرض سے شام، بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر کیے۔ اور آپ ﷺ دیانت اور امانت داری کی شہرت دور دور تک پھیل گئی"۔[1]

لیکن صحیح کے ساتھ جب غلط شامل ہوجائے تو وہ لوگوں کی زندگیوں کو اجیرن بنا دیتا ہے، مشکل زندگی سے وابستہ کئی لوگ اور بسا اوقات کئی گھرانے فقر و فاقہ کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور مجبوراً محرومی کی زندگی بسر کرتے ہیں، روز گار کے مواقع ختم کرنے کا ایک ناجائز طریقہ جو رائج ہو چکا ہے ، اس میں بڑا کردار جوئے بازی کا ہے، جس سے کئی لوگوں کو فکر معاش کی بجائے راتوں رات امیر بننے کا خواب لے ڈوبتا ہے اور وہ اپنی نسلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو محنت سے جی چراتے اور نہایت آرام سے حرام کھانا چاہتے ہیں ، اسے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں بعض لوگ تو اپنا مکان دائو پر لگا دیتے ہیں، صاحبِ تحفۃ الاحوذی علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ تحفۃ الاحوذی میں قمار (جوئے) کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((لِاَنَّ الْقُمَارَ يَكُوْنُ الرَّجُلُ مُتَرَدِّدًا بَيْنَ الْغَنَمِ وَالْغَرَمِ))۔[2]

"یعنی قمار میں مقامر کو یا نفع ہی نفع ہوتا ہے یا نقصان ہی نقصان"۔

جب وہ بازی لگاتا ہے تو ہارنے کی صورت میں اس کی اپنی پونجی بھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور اگر وہ بازی جیت لیتا ہے تو دوسرے بازی لگانے والوں کا سرمایہ بھی اس کو مل جاتا ہے اس میں سراسر نقصان یا سراسر فائدہ ہے۔

امام فخر الدین رازی میسر (جوا) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((لِاَنَّ الْمَيْسِرَ مَا يُوْجِبُ دَفْعَ الْمَالِ، أَوْ أَخْذَ مَالٍ))[3]

"یعنی قمار اس کو کہتے ہیں جس میں سارا مال ہاتھ سے نکل جاتا ہے یا سارا اس کی جھولی میں آگرتا ہے"۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

{لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ}[4]

"تم آپس میں اپنے اموال باطل اور ناجائز ذریعہ سے مت کھائو"۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ}[5]

"اے ایمان والو! یہ شراب ، جوا، بت او رجوئے کے تیر، سب ناپاک ہیں ، شیطان کی کارستانیاں ہیں سو بچو ان سے تاکہ تم فلاح پاجائو"۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

{اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ}[6]

---

[1] خالد علوی، "انسان کامل"، یونیورسٹی بک ایجنسی انار کلی۔ لاہور، ص:۷

[2] مبارکپوری، عبد الرحمن، مولانا، "تحفۃ الاحوذی"، ج:۳، ص:۳۰

[3] الرازی، فخر الدین، امام، "تفسیر الفخر الرازی"، دار الفکر، بیروت۔ لبنان، ج:۲، ص:۲۲۰

[4] النساء، ۴: ۲۹

[5] المائدہ، ۵: ۹۱

[6] المائدہ، ۵: ۹۰

”یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض، شراب اور جوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یادِ الٰہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے والے ہو؟“۔

اس آیت میں اللہ نے شراب و جوئے کی حرمت کی حکمتیں بیان فرماتے ہوئے بتایا ہے کہ شراب خوری اور قمار بازی سے باہمی محبت و پیار کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں اور حسد و عداوت کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں کیونکہ جب کسی جسمانی کاوش اور ذہنی ریاضت کے بغیر کسی کی دولت حاصل کرلی جاتی ہے تو باہمی خیر سگالی کے جذبات دم توڑ دیتے ہیں اور ہارنے والے کے سینہ میں حسد و عناد کے انگارے دہکنے لگتے ہیں، نیز یہ اللہ کے ذکر سے انسان کو غافلکر دیتا ہے اور نماز پڑھنے کی مہلت بھی نہیں دیتا۔

مفتی محمد تقی عثمانی ”اسلام اور جدید معاشی مسائل“ میں قمار بازی سے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر ہم قمار کی نپی تلی قانونی تعریف کرنا چاہیں تو وہ کچھ اس طرح ہو گی:

”قمار ایک سے زائد فریقوں کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں ہر فریق نے کسی غیر یقینی واقعے کی بنیاد پر اپنا کوئی مال (یا تو فوری ادائیگی کرکے یا ادائیگی کا وعدہ کرکے) اس طرح داؤ پر لگایا ہو کہ یا تو وہ مال بلا معاوضہ دوسرے فریق کے پاس چلا جائے گا، یا دوسرے فریق کا مال پہلے فریق کے پاس بلا معاوضہ آجائے گا...

دوسری بات یہ ہے کہ ’قمار‘ کی حقیقت کا ایک لازمی عنصر یہ ہے کہ اس میں متعلقہ غیر یقینی واقعہ پیش نہ آنے کی صورت میں داؤ پر لگی ہوئی رقم بلامعاوضہ دوسرے فریق کے پاس چلی جاتی ہے، اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا، لہٰذا اگر کسی رقم کا پورا پورا معاوضہ ملنا ہر صورت میں یقینی ہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رقم داؤ پر لگائی گئی ہے، یا اسے خطرے میں ڈالا گیا ہے، اور چونکہ اس قسم کا ’خطرہ‘ قمار کا لازمی حصہ ہے، اس لیے جو معاملہ ایسے خطرے سے خالی ہو، اس کو قمار نہیں کہا جاسکتا“۔[1]

قرآن مجید میں چند دوسری علتوں کے ساتھ جوئے کے قباحت کو بیان کرکے اس کے برے نتائج سے باز رہنے اور اسے شیطانی عمل گردانتے ہوئے ایمان والوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صرف جوئے کا ارادہ کرنے والے کے لیے تنبیہ فرمائی، حضرت ابوہریرہh بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ قَالَ لِصَاحِبِہِ: تَعَالَ أُقَامِرْکَ، فَلْيَتَصَدَّقْ“۔[2]

”جس نے اپنے کسی دوست کو کہا کہ آئو قمار (جوا) کھیلیں، تو اسے چاہیے کہ (بطور کفارہ) صدقہ کرے“۔

”اسلامی شریعت کا یہ ایک طے شدہ اصول ہے جس کی تائید قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث نبوی سے ہوتی ہے کہ ہر وہ چیز شرعاً جائز ہے جس کی ممانعت یا کراہت قرآن و سنت سے ثابت نہ ہوتی ہو، اس اصول کے تحت کاروبار اور تجارت کی ہر قسم جائز ہے جس کی قرآن پاک اور سنت رسول ﷺ سے ممانعت یا کراہت ثابت نہیں ہوتی، قرآن پاک نے ہر اس تجارت اور کاروبار کو جائز قرار دیا ہے جس کی بنیاد فریقین کی آزادانہ رضامندی (تراضی) پر ہو، ان اصولوں کے تحت ہر وہ کاروبار اور تجارت ممنوع ہے جس میں فریقین کی آزادانہ اور حقیقی رضامندی نہ پائی جاتی ہو، جن چیزوں کو شریعت نے آزادانہ رضامندی (تراضی) میں مخل قرار دے کر حرام ٹھہرایا ہے وہ ”ربوا“ کے علاوہ یہ ہیں:

قمار: قرآن پاک میں قمار کے لیے میسر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کو گندا شیطانی کام قرار دیتے ہوئے اس سے سب اہل ایمان کو بچنے کا حکم دیا ہے، مختصراً قمار اور میسر سے مراد اصولِ زر کی ہر وہ شکل ہے جس میں یافت کا دارومدار خالصتاً بخت و اتفاق پر ہو اور دوسرے یکساں حق رکھنے والوں کے مقابلہ میں ایک شخص کسی لاٹری، قرعہ اندازی یا محض کسی اور اتفاق کے نتیجہ میں کوئی آمدنی حاصل کرے، جوا (Gambling & Vager) اور ہر قسم کے (Games of Chance) قمار میں شامل ہیں...

اس کے علاوہ غرر (Aleatory/Gharar) شک و شبہ سے بھرپور اور غیر یقینی کا معاملہ، غبن فاحش (Grave Deception) دھوکہ اور غلط بیانی یا کسی شخص کی مجبوری سے یا ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے کسی چیز کی زائد قیمت وصول کرنا، اکراہ (Duress) زبردستی اور دھونس اور جبر سے کوئی معاملہ کرا لینا، خلابہ (Cajole) دھوکہ، غلط بیانی اور صورت حال کی خلافِ واقعہ تصویر کشی کرکے مال لوٹنا وغیرہ شامل ہیں اور یہ سب کام شرعاً حرام ہیں“۔[3]

پاکستان کو معاشی محرومیوں سے بچانے کے لیے ازحد ضروری ہے کہ ایسے قوانین تشکیل دیئے جائیں اور پھر ان پر علمدرآمد اس سے زیادہ ضروری ہے، جس سے ایسے ناجائز اقدامات کی روک تھام کی جاسکے، اور لوگوں کو جائز کسب معاش کی طرف راغب کیاجاسکے۔ امام غزالی نے معاشی تنگدستی سے دوچار کرنے والے ایسے گروہ کا ذکر

---

[1] تقی عثمانی، مولانا محمد، جسٹس، ”اسلام اور جدید معاشی مسائل“، ادارہ اسلامیات۔ لاہور، ج:۳، ص:۳۵۸

[2] مسلم، ”الجامع الصحیح“، کتاب الایمان، بَاب من حلف باللاتِ والعُزی، فلیقل: لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ

[3] رپورٹ اسلامی نظام بیمہ، اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد۔ پاکستان، ۴ جون ۱۹۹۲ء، ص:۴۷۔۴۸

اپنی کتاب ”احیاء علوم الدین“ میں کیا ہے، جسے دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے آج ہی کے مسائل امام صاحب نے قلمبند کیے ہیں، ان علتوں کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنے لیے، اپنے خاندان پر اور ملک و قوم کے لیے بوجھ اور بسا اوقات جرائم کی بڑی وجہ بن جاتے ہیں، امام صاحب لکھتے ہیں:

”بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جنہیں قدرے مشقت اور مناسب تربیت کے بعد ہر کوئی اختیار کر سکتا ہے، لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ بچپن کی لاپرواہی کی وجہ سے محنت کرنے کے عادی نہیں بنتے، یا کسی وجہ سے وہ عادی نہیں بن پاتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کام سے ناواقف ہونے کا بہانہ بنا کر یہ لوگ کام کرنے سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے ٹکڑوں پر گزارہ کرنا پسند کر لیتے ہیں اور جب یہ نوبت آجاتی ہے تو گداگری اور اٹھائی گیری جیسے دو گھٹیا قسیم کے پیشے وجود میں آتے ہیں اور ہم جو اس کی کڑی کام سے جی چرانے سے ملاتے ہیں تو اسی لیے کہ محنت نہ کرنا اور دوسرے کی کمائی میں حصہ لگانا، اٹھائی گیری اور گداگری میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے۔

پھر جس وقت عوام اٹھائی گیروں سے چوکنا ہو کر اپنے گھر بار کی گنرانی شروع کرتے ہیں تو یہ لوگ بھی مجبوراً پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنے دماغ پر زور دے کر نئے نئے ہتھکنڈے اور نت نئی چالیں سوچتے ہیں۔ چنانچہ جن کا ذہن چوری کی طرف مائل ہوتا ہے، وہ ٹولیاں اور ٹکڑیاں بنا کر پہلے کچھ طاقت حاصل کرتے ہیں اور پھر ایک زبردست گینگ کی شکل اختیار کرلینے کے بعد ڈکیتی اور رہزنی کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور جو ذرا ڈرپوک ہوتے ہیں، وہ پس پردہ سازشوں اور ہاتھ کی صفائی میں لگ جاتے ہیں اور نقب زنی، گرہ کٹی یا عیاری و مکاری کے کسی راستے کو اپنا کر روپیہ اینٹھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، لیکن جو چوری کو برا سمجھتے ہیں، مگر محنت بھی نہیں کرنا چاہتے، ایسے لوگ جب دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یہ طعنے سنتے ہیں کہ جاؤ محنت کرو، جیسے دوسرے کما کر کھاتے ہیں، تم بھی کماؤ کھاؤ، اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کیا حاصل ، پھر تمہیں تو یوں ہاتھ بھی نہیں پھیلانا چاہیے...اس قسم کی تیز و تند باتیں جب ان کے کانوں میں پڑتی ہیں ، تب لوگوں کی مٹھی سے روپیہ نکالنے کے لیے یہ لاکھ جتن کرتے ہیں اور اپنی مسکینی محتاجی اورلاچاری کو ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بعض حرکتیں اس قدر اوچھی ہوتی ہیں جو حقیقت میں انہیں قابل رحم بنا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ تو سچ مچ اندھے بن جاتے ہیں، یا کسی اندھے کے سرپرست بن بیٹھتے ہیں اور نہیں تو کسی فالج زدہ، پاگل، اپاہج ، یا بیکار کا روپ دھار لیتے ہیں، یہاں کہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا کرنے میں انہیں خود زحمت اٹھانا پڑتی ہے، مگر یہ نادان اس کی مطلق پروا نہیں کرتے، ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ من گھڑت باتیں اور مضحکہ خیز کرتب سیکھ لیتے ہیں، تاکہ لوگ ان کے فریب میں آجائیں ، خواہ بعد میں انہیں اپنی نادانی پر افسوس کیوں نہ ہو، پھر عام طور سے یہ لوگ سچے جھوٹے قصے، مقفی عبارتیں اور جوشیلی نظموں کا سہارا لیتے ہیں۔ جنہیں اچھی آواز سے دلنشین انداز میں سناتے ہیں، ان کی تاثیر اس وقت سوا ہو جاتی ہے جب ان میں مذہب کی آمیزش یا حسن و عشق کا سوز و گداش شامل ہو جاتا ہے، کچھ لوگ سازو آواز کا سہارا لیتے ہیں اور چنگ و رباب سے لوگوں کو مسحور کرتے ہیں...

ان پڑھ اور سیدھے سادے لوگوں کو جھانسہ دے کر روپیہ اینٹھنے کا کام وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک سے بیماریوں اور آسیب کے علاج کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں کے نقش قدم پر نجومی ، جیوتشی اور فال کھولنے والے چلتے ہیں، اسی زمرہ میں وہ چرب زبان واعظین بھی آتے ہیں جو عوام کی نادانی اور اپنی ہوشیاری کی وجہ سے منبروں تک پہنچ جاتے ہیں ، ان میں علمی قابلیت برائے نام ہوتی ہے، لیکن عوام کو رام کرنے اور ان کی جیبیں خالی کرنے میں یہ بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نشانے بہت کم خطا کرتے ہیں...

قصہ کوتاہ! روپیہ اینٹھنے کے ان طریقوں کو شمار کیاجائے تو ان کی تعداد سینکڑوں سے اوپر ہی نکلے گی“۔[1]

گداگری سے خاندان میں وراثتی غربت ملتی ہے جو نسل در نسل چلی آرہی ہے، لوگ اپنی وراثت کو چلانے کے لیے بڑے بڑے وسیع پیمانے پر کاروبار کرتے ہیں، اپنی معاشی حالت کو بڑھاتے ہیں اور اپنی جائیدادیں بناتے ہیں تاکہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی بھی اچھے طریقے سے پوری کر لیں اور ان کی زندگی کے بعد بھی ان کی اولادیں اس مال و دولت جائیداد وغیرہ سے چین کی زندگی گزاریں اور نسل در نسل وہ امراء طبقہ میں شمار رہیں، اس ضمن میں لوگ بہت سا سازو سامان و جائیداد بنک بیلنس اور کاروبار سے اپنی اولادوں کو سپورٹ کرتے ہیں۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ ان کی جائیداد کا کوئی حساب ہی نہیں ، ان کی اولادیں نسلی طور پر نواب ہوتی ہیں، انہیں کام کاج کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، کچھ خاندان ایسے ہیں جو اولاد پیدا ہوتے ہی ان کی جائیداد ، کاروبار وغیرہ کا بندوبست کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس ضمن میں وہ علیحدہ علیحدہ طریقے استعمال کرتے ہیں، مثلاً رہائش کے لیے پلاٹ کی خرید، منافع بخش اسکیموں میں ماہانہ روپیہ پیسہ دینا، اولاد کے لیے سامان وغیرہ خریدنا، یہاں تک کہ لوگ اپنی اپنی طاقت کے مطابق اپنی اولادوں کو زیادہ سے زیادہ وراثت میں سے حصہ دیتے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں معاشی تنگی کا شکار نہ ہوں، دربدر نہ پھریں، دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی اولاد کی

---

[1] الغزالی، ابوحامد محمد، امام، ”احیاء علوم الدین“، مترجم: مولانا ندیم الواجدی، دارالاشاعت۔ کراچی، ج:۳، ص:۳۵۶۳۵۵

وراثت کے لیے بڑا کچھ کرتے ہیں ، تاکہ کل کو ہماری اولاد کے کام آئے اور وہ کسی کے مرہونِ منت نہ رہیں، لوگ اپنی اولاد کے تحفظ کے لیے ڈھیروں ڈھیر جمع کر کے ان کو دے جاتے ہیں جس سے وہ پوری زندگی فائدہ مند ہوتے رہتے ہیں۔ گداگر اپنی اولاد کو وراثت میں غربت و افلاس کا تحفہ دیتا ہے اس کے علاوہ ان لوگوں کی کوئی وراثت نہیں ، وہ اپنی اولاد کو دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے کا عملی درس دے جاتے ہیں، یہی ان کی وراثت ہے کہ وہ نسل در نسل گداگری کے بول سنا کر لوگوں سے روٹی کے ٹکڑے حاصل کریں اور زندگی گزاریں۔

فقیری و محتاجی کو پوری زندگی بہانہ بنانا کسی بھی مسلمان کے جائز نہیں کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے توکل کا غلط مفہوم سمجھتا رہے، اور دربدر بھٹکتا رہے، ڈاکٹر یوسف قرضاوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”اسلام اپنے اصول و ضابطے اور اپنے دستور اور نصب العین کے ذریعہ فقروناداری کی بیخ کنی کرتا ہے، ایک سے زائد تدابیر کے ذریعے اس کی کوشش کرتا ہے کہ غریبوں کی غریبی کا خاتمہ ہو اور دوسروں کی طرح یہ بھی آسودہ اور بے نیازہوں، لیکن تمام کوشش اور کاوش کے باوجود اگر کوئی فرید یا گروہ غری رہا تو اسلام کی نظر میں انہیں کسی صورت غریب طبقہ کے نام سے یاد نہیں کیاجاسکتا، اس لیے کہ ’طبقیت‘ ایک قسم کی گروہ بندی کا نام ہے، جا قانون اور رواج کے سہارے قائم اور نسل در نسل اس کا سلسلہ برقرار رہتا ہے، لیکن جہاں تک غریبی کا تعلق ہے ، اسلامی دستور اور اسلامی ماحول غریبی کو خاندانی اثرات کی شکل میں فرد واحدیا سماج پر مسلط نہیں کرتا، نہ یہ پسند کرتا ہے کہ خاندان میں پشت در پشت غربت اور افلاس باقی رہے، اسلام کی نظر میں غربت راسخ یا اٹل نہیں، دھوپ چھائوں آنی جانی ہے، کبھی اس کا وجود ہوتا ہے، کبھی یہ اوجھل ہو جاتی ہے اور کبھی یکسر ناپید ہو جاتی ہے، اسلامی معاشرے میں مفلس اور غریب کسی گروہ کی شکل میں برقرار نہیں رہ سکتے، اس لیے کہ اگر آج کوئی غریب ہے تو کل وہ صاحب ثروت اور مال دار بھی بن سکتا ہے، کیونکہ عزم و حوصلہ کا اظہار اور حدود میں رہ کر جستجو اور محنت کا استعمال ہر کوئی کر سکتا ہے، یہ دروازہ کسی کے لیے بند نہیں“۔[1]

پاکستان میں اس وقت مختلف فنون کو اختیار کرنے والا اور محنت سے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے والا شخص بیسیوں طریقوں سے روزگار کے مواقع حاصل کر سکتا ہے۔ حکمران اور عوام دونوں ہی اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ وہ کس کس انداز سے اپنے وسائل کو استعمال کرتے ہوئے معاشی محرومیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے یا کم از کم انہیں محدود کرنے میں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بھوک وافلاس ختم کرنے کے لیے یہی بنیادی ذرائع ہیں جن پر قوم کو مجموعی طور پر ہنر مند اور محنتی بناکر غربت کو کم کیاجاسکتا ہے، ورنہ صدقات و خیرات اور مختلف اوقاف کبھی بھی معاشی محرومیوں کا مستقل حل نہ ماضی میں رہے ہیں اور نہ ہی آئندہ ہوں گے۔ صرف یہ صدقات محدود پیمانے پر انہی لوگوں کے لیے کارگر ثابت ہو سکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں قابل رحم اور معذور ہیں، جن میں یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے سہارا بوڑھے، مفلوک الحال اور بے روزگار گھرانے جنہیں باوجود کوشش کے ایسا روزگار نہیں ملتا جس سے وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکیں، ان مجبوروں کے علاوہ کوئی بھی شخص غربت کا دعویٰ کرکے سرکاری و غیر سرکاری شخصیات سے مالی امداد کا مطالبہ نہیں کرسکتا، جس سے مسائل گھٹنے کی بجائے بڑھتے ہوں۔

---

[1] القرضاوی، علامہ یوسف، ”اسلام میں غریبی کا علاج“، ترجمہ: نصیر احمد ملّیٰ، مکتبہ اسلامیہ۔ لاہور، ص: ۲۲۸